10

غیر مبائعین میں تبلیغ محبت اور نرمی سے کی جائے

(فرمودہ 19 اپریل 1940ء)

تشہد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:

"ایک تو مجھے آج نزلہ کی شکایت ہے، گلا خراب ہے دوسرے لاؤڈ سپیکر کا آلہ بھی خراب ہو گیا ہے لیکن میں جہاں تک ہو سکا اپنے گلے پر زور ڈال کر کوشش کروں گا کہ آواز دوستوں تک پہنچ جائے۔

میں نے گزشتہ دو خطبات میں جماعت کو اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ غیر مبائعین میں تبلیغ کے متعلق نئے سرے سے جدوجہد کریں اور کوشش کریں کہ ان میں سے جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہدایت مقدر کی ہو اُن کو ہدایت دے کر اس فتنہ کے زور کو توڑے اور جو روحیں صحیح رستہ سے دور ہو کر بھٹک رہی ہیں ان کو قبولِ حق کی توفیق ملے۔ میری اس تحریک کے مطابق بعض دوستوں نے مضامین لکھنے شروع کئے ہیں یا ممکن ہے وہ پہلے کے ہی لکھے ہوئے ہوں جو اَب شائع ہوئے ہوں۔ بہر حال میں دیکھتا ہوں کہ دوستوں میں اب زیادہ توجہ نظر آتی ہے اور جن کو لکھنے کی توفیق اللہ تعالیٰ نے دی ہے وہ مضامین لکھ رہے ہیں اور غور و فکر کر رہے ہیں لیکن ایک بات جس کی طرف میں جماعت کو پہلے بھی بارہا توجہ دلا چکا ہوں اب پھر کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ محض فتح مومن کے لئے خوشی کا موجب نہیں ہو سکتی بلکہ وہ فتح خوشی کا موجب ہوتی ہے جس میں خدا تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہو۔

پس اگر ہم ان طریقوں کو استعمال میں لائیں جن سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہو اور ان کے نتیجہ میں فتح حاصل ہو تو یہ فتح بے شک خوشی کا موجب ہو گی بلکہ ان طریقوں کو استعمال میں لاتے ہوئے اگر شکست بھی ہو جائے تو وہ بھی خوشی کا ہی موجب ہو گی۔ بعض دفعہ ایسی شکست عظیم الشان کامیابیوں کا موجب ہو جاتی ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ابتدائی زمانہ کا ایک ایسا واقعہ ہے جسے خدا تعالیٰ نے قبول فرمایا بلکہ وہ سلسلہ کی بنیاد کا محرک ہو گیا۔ آپ ایک مرتبہ جوانی کے ایام میں بٹالہ تشریف لے گئے۔ مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی جو بعد میں آپ کے مُکفِّر بن گئے نئے نئے حدیث کا علم پڑھ کر بٹالہ آئے تھے اور نیا نیا جوش تھا وہ ہر مجلس میں حنفیوں کو بُرا بھلا کہتے تھے اور حنفیوں میں بھی ان کے مقابلہ کا بہت جوش تھا مگر ان کا کوئی مولوی ان کے سامنے ٹھہرتا نہیں تھا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام جو اتفاق سے بٹالہ تشریف لے گئے تو ایک شخص نے ان سے کسی اختلافی مسئلہ میں بحث کے لئے آپ کو مجبور کیا اور کہا کہ وہ کفر کی باتیں کرتے ہیں اور اسلام کے خلاف عقائد رکھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اچھا چلو دیکھتے ہیں۔ چنانچہ آپ تشریف لے گئے، لوگ بہت جمع تھے اور بڑا ہجوم ہو گیا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اور مولوی محمد حسین صاحب آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ آپ نے مولوی صاحب سے پوچھا کہ آپ کا کیا دعویٰ ہے؟ مولوی صاحب نے کہا کہ میرا دعویٰ یہ ہے کہ سب سے مقدم قرآن کریم ہے اور اس کے بعد آنحضرت صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا قول اور اس کے مقابل پر ہم کسی اور انسان کے قول کو نہیں لے سکتے۔ آپ نے یہ بات سن کر فرمایا کہ آپ کی یہ بات تو معقول ہے۔ اس پر لوگوں نے شور مچا دیا کہ ہار گئے، ہار گئے۔ جو لوگ آپ کو ساتھ لے گئے تھے وہ بڑے غصہ میں آئے کہ آپ نے ہم کو ذلیل کر دیا مگر آپ نے کسی بات کی پرواہ نہ کی اور فرمایا کہ کیا میں یہ کہوں کہ امت کے کسی فرد کا قول محمد مصطفیٰ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے قول پر مقدم ہے۔ اور اس طرح خاص اللہ تعالیٰ کے لئے بحث کو ترک کر دیا۔ رات کو خداوند کریم نے اپنے الہام اور مخاطبت میں اسی ترکِ بحث کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ ''تیرا خدا تیرے اس فعل سے راضی ہؤا اور وہ تجھے بہت برکت دے گا یہاں تک کہ بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت

ڈھونڈیں گے۔" 1

پھر بعد اس کے عالمِ کشف میں وہ بادشاہ دکھلائے گئے جو گھوڑوں پر سوار تھے۔ 2 چونکہ آپ نے خالصۃً خدا اور اس کے رسول کے لئے انکسار اور تذلّل اختیار کیا اس لئے اس محسنِ مطلق نے نہ چاہا کہ آپ کے اس فعل کو بغیر اجر کے چھوڑے۔

تو بعض اوقات شکست زیادہ بہتر ہوتی ہے اُس فتح سے جس میں خدا تعالیٰ کی خوشنودی نہ ہو۔ یہ بات میں نے پہلے بھی کئی بار کہی ہے اور اب پھر اسے دہرا دیتا ہوں کہ غیر مبائعین کے مقابلہ پر ایسے ذرائع اختیار کرو جو خدا تعالیٰ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی کا موجب ہوں۔ میں نے بار بار سخت کلامی سے روکا ہے۔ مجھے سخت کلامی کبھی پسند نہیں خواہ وہ میرے شدید سے شدید مخالف کے متعلق ہی کیوں نہ ہو۔ بے شک بعض حقائق کے بیان کرنے میں بعض سخت الفاظ کا استعمال کرنا پڑتا ہے جو دوسرے کے لئے ناگوار ہوتے ہیں مگر ان کے بیان میں بھی جہاں تک ممکن ہو سخت الفاظ سے بچنا چاہیئے اور ایسے رنگ میں بات کو بیان نہ کیا جائے کہ دوسرا سمجھے کہ اس کے دل میں غصہ اور بُغض ہے جو یہ نکال رہا ہے۔ ایک ہی بات کو سخت الفاظ میں بھی ادا کیا جا سکتا ہے اور اسی کو نرم الفاظ میں بھی۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک واقعہ سنایا کرتے تھے۔ لاہور میں ایک خاندان فقیروں کا مشہور ہے۔ ہمارے خاندان کے ساتھ ان کے تعلقات پرانے چلے آتے ہیں۔ ہمارے بڑے بھائی خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب مرحوم اور اس خاندان کے آخری رئیس بھائی بھائی بنے ہوئے تھے۔ ان کے دادا مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وزیر تھے اور وہ بہت بلند پایہ طبیب تھے اور اس وجہ سے بہت اثر رکھتے تھے۔ گو اُس زمانہ میں مسلمانوں کی حالت اچھی نہ تھی مگر انہیں طب کی وجہ سے اور ذاتی قابلیت کے باعث بہت رسوخ حاصل تھا۔ مسلمانوں کو اُس زمانہ میں چونکہ مصائب کا شکار ہونا پڑتا تھا اس لئے جس کسی کو کوئی مصیبت پیش آتی ان کے پاس امداد کے لئے پہنچ جاتا تھا اور آپ ہر ایک کی کچھ نہ کچھ مدد کر دیتے اور جو تھوڑی بہت رقم ممکن ہوتی دے دیتے۔ اُس زمانہ میں پیسہ کی بہت قیمت تھی۔ روپیہ کا دس دس من غلہ ملتا تھا۔ ایک دفعہ ان کے پاس کوئی محتاج آیا وہ بیٹھے کام کر رہے تھے اور اپنے نوکر سے کہہ دیا کہ

میاں اسے آٹھ آنہ کے پیسے دے دو۔ نوکر نے دیئے تو اس نے شور مچا دیا کہ اتنے بڑے آدمی ہو کر آپ مجھے صرف آٹھ آنے دیئے ہیں۔ حالانکہ اُس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے یہ بھی کافی تھے۔ روپیہ مہنگا تھا اور میرا خیال ہے کہ وزیر کی تنخواہ بھی اس وقت دو تین سو روپیہ ہی ہوتی ہو گی مگر باوجود اس کے وہ مخیر آدمی تھے اور جو حاجت مند آتا جو کچھ ممکن ہوتا اسے دے دیتے مگر اس محتاج نے شور مچا دیا اور کام کرنا مشکل کر دیا۔ آپ نے اسے بہت سمجھایا مگر وہ باز نہ آیا اور کام میں حرج کرنے لگا آخر مجبور ہو کر آپ نے نوکر سے کہا کہ اسے پولے پولے (نرم نرم) دھکّے مار کر باہر نکال دو۔ گو وہ مجبور ہو گئے کہ دھکّے مار کر اسے نکالیں مگر شرافت کی وجہ سے پولے پولے دھکّے مارنے کی ہدایت بھی ساتھ ہی کر دی۔ تو اگر انسان نرمی اور محبت کو اپنا شعار بنا لے تو لڑائی میں بھی ایسے الفاظ استعمال کیے جا سکتے ہیں کہ جو سخت نہ ہوں۔ جس طرح فقیر صاحب کی مثال میں نے دی ہے۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ سخت کلامی اخلاص پر دلالت نہیں کرتی۔ اس کی ایک تازہ مثال آپ لوگوں کے سامنے ہے یعنی میاں فخر الدین ملتانی کی۔ ان کی ٹھوکر کا موجب ہی ان کی یہ سخت کلامی ہوئی۔ وہ ہمیشہ پیغامیوں کے خلاف سخت مضامین لکھا کرتے تھے۔ میں نے ڈانٹا کہ یہ طریق مجھے پسند نہیں کہ مضامین میں گالیاں دی جائیں خواہ وہ میرے شدید مخالفوں کو ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ بات ان کو بُری لگی کہ مَیں تو ان کے لئے قربانی کرتا ہوں، ان کے مخالفوں کا مقابلہ کرتا ہوں اور یہ ناراض ہوتے ہیں۔ انہوں نے پھر ویسا ہی مضمون لکھا اور میں نے پھر ڈانٹا اور ان کو پھر بُرا لگا۔ دو تین بار ایسا ہی ہؤا آخر میں نے ان کو کہا کہ اگر پھر ایسا مضمون لکھا تو سزا دوں گا۔ اس پر ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہؤا کہ یہاں کام کرنے والوں کی کوئی قدر نہیں ان کے نزدیک قدر کے یہی معنے تھے کہ میں خدا، رسول، اسلام اور اخلاق کی کوئی پرواہ نہ کرتا اور اس پر خوش ہو جاتا کہ یہ شخص میری مدد کرتا ہے۔ حالانکہ اصل چیز تو خدا تعالیٰ کی خوشنودی ہے اور میں تو خدا تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہوں۔ اگر وہی ناراض ہو کہ میں نے گالیاں دلوائیں تو میں فخر دین صاحب کی امداد کو کیا کرتا۔ اس بات سے ان کو ٹھوکر لگ گئی اور یہی سخت کلامی ابتلاء کا موجب ہو گئی۔ چنانچہ بعد میں جب ان کے بیان لئے گئے تو یہی معلوم ہؤا کہ

اصل ٹھوکر کا موجب یہی بات ہوئی ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ جب مجھے معلوم ہؤا کہ حضرت صاحب ناراض ہیں تو میں نے دو تین بار یہ دریافت کرایا کہ ناراضگی کا باعث کیا ہے؟ تو معلوم ہؤا کہ میرے جو مضامین فاروق میں شائع ہوتے ہیں ان کی وجہ سے ناراض ہیں۔ اور بھی کئی شخص میں نے دیکھے ہیں کہ جن کو اسی بات سے ٹھوکر لگی کہ وہ سمجھتے ہم تائید کر رہے ہیں اور میں اسے ناپسند کرتا۔ ایسی تائید جو غلط طریق سے ہو وہ مجھے کبھی پسند نہیں آئی اور میں کبھی برداشت نہیں کر سکتا کہ اس رنگ میں میری مدد کی جائے اور کوئی انسان مدد کر بھی کیا سکتا ہے اگر خدا تعالیٰ ناراض ہو جائے۔ اصل جواب دہی تو خدا تعالیٰ کے سامنے کرنی ہوتی ہے۔ اگر اسلام، احمدیت اور اخلاق جاتے رہیں تو خواہ کروڑوں مضامین لکھے جائیں ان کی قیمت اتنی بھی نہیں جتنی ان کاغذوں کی جن پر وہ لکھے جاتے ہیں۔

پس مَیں دوستوں کو ہدایت کرتا ہوں کہ جو مضمون بھی لکھیں نرمی اور محبت سے لکھیں۔ یہ صحیح ہے کہ جہاں کوئی تلخ مضمون آئے گا اس کی کچھ نہ کچھ تلخی تو باقی رہے گی لیکن جہاں تک ہو سکے الفاظ نرم استعمال کرنے چاہئیں۔ مثلاً کسی نے چوری کی ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ اس نے فلاں چیز بلا اجازت اٹھالی ہے لیکن اگر یہ کہا جائے کہ وہ چور ہے تو اس بات میں تلخی ضرور پیدا ہو جائے گی اس لئے ایسی بات کو بھی نرم الفاظ میں ادا کرنا چاہیئے۔

مَیں مانتا ہوں کہ پیغامیوں کی طرف سے ہمیشہ سختی کی جاتی ہے اس لئے بعض دوست جواب میں سختی سے کام لیتے ہیں مگر مجھے یہ طریق سخت ناپسند ہے۔ میں نے کئی دفعہ بتایا ہے کہ شدید سے شدید دشمن کے متعلق بھی سخت کلامی مجھے پسند نہیں۔ میرے نزدیک مولوی ثناء اللہ صاحب ہمارے اشد ترین دشمن ہیں مگر میں نے کئی بار دل میں غور کیا ہے ان کے متعلق بھی اپنے دل میں کبھی بغض نہیں پایا اور میں سمجھتا ہوں اگر کسی دشمن کے متعلق دل میں بغض رکھا جائے تو اس سے اسلام کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ سوائے اس کے کہ میرا دل کالا ہو۔ ہر شخص کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ اگر کسی کو سزا دینی ہے تو اس نے اور اگر کسی کو بخشنا ہے تو اس نے۔ میں کیوں اپنے دل میں بغض رکھ کر اسے سیاہ کروں۔ پس دل میں بغض اور کینہ رکھ کر کام نہ کرو بلکہ محبت و اخلاص رکھ کر کرو۔ جوش اور اخلاص کے ساتھ ضروری نہیں کہ کینہ شامل ہو۔

خدا تعالیٰ سے زیادہ صداقت کے لئے کس کو جوش ہو سکتا ہے؟ محمد رسول اللہ ﷺ سے زیادہ جوش کسے ہو سکتا ہے؟ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے زیادہ کسے ہو سکتا ہے؟ مگر دیکھ لو انہوں نے سختی سے کام نہیں لیا۔ وہ سوائے اس کے کہ جہاں مجبور ہیں کہ صداقت کو بیان کریں کبھی سختی سے کام نہیں لیتے۔ بعض لوگ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا حوالہ دے دیتے ہیں کہ آپ نے فلاں جگہ یہ لفظ استعمال کیا ہے مگر یہ نہیں سوچتے کہ آپ کی ایک پوزیشن مجسٹریٹ کی ہے۔ مجسٹریٹ کو مجبوراً اپنے فیصلہ میں بعض الفاظ استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ مثلاً جب اس کے سامنے کسی چور کا مقدمہ پیش ہو تو اسے سزا دیتے وقت اسے لکھنا پڑتا ہے کہ تم نے چوری کی ہے اس لئے میں تمہیں چھ ماہ قید کی سزا دیتا ہوں۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ چونکہ تم نے دو رکعت نماز ادا کی ہے اس لئے چھ ماہ قید کی سزا دیتا ہوں اسے مجبوراً چور کا لفظ استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اگر وہ مجسٹریٹ نہ ہوتا تو ممکن ہے وہ چور کا لفظ استعمال نہ کرتا مگر چونکہ سرکاری قانون چوری کی سزا مقرر کرتا ہے اس لئے اسے یہ لفظ استعمال کرنا پڑتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے حَکَم تھے اس لئے بعض دفعہ آپ نے بعض موقعوں پر بعض لوگوں کی حقیقت بیان کرنے کے لئے مجبوراً بعض الفاظ استعمال کئے ہیں مگر وہ مجسٹریٹ کی حیثیت سے کئے ہیں اور چونکہ ہماری یہ پوزیشن نہیں اس لئے ہمیں ایسے الفاظ استعمال نہیں کرنے چاہئیں۔ ہمارے لئے ان الفاظ کا استعمال اسوہ نہیں ہے۔ ہمارے لئے اسوہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔ آپ نے ذاتی حیثیت سے جو جواب دیئے ہیں وہ ایسے نرم ہیں کہ پڑھنے والے کے دل پر اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اِسی طرح قرآن مجید کے بعض الفاظ کو سخت کلامی کی تائید میں پیش کرنا درست نہیں کیونکہ وہ بھی حقیقت کے بیان کے طور پر ہیں اور پھر بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض الفاظ دوسرے کلام سے مل کر نرم ہو جاتے ہیں اور اگر دوسرے کلام سے علیحدہ کر کے دیکھا جائے تو سخت معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً حضرت مسیح ناصری علیہ السلام نے یہودیوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم ابراہیم کے فرزند نہیں ہو بلکہ تمہارا باپ ابلیس ہے۔ اب یہ سخت لفظ ہے لیکن اس کے استعمال کی وجہ یہ تھی کہ آپ کے متعلق یہود نے بعض ایسے الفاظ استعمال کئے تھے کہ یہ خدا تعالیٰ کے مقبول بندے نہیں اور کہا تھا کہ تُو

سامری ہے اور تجھ میں بدروح ہے۔ آپ نے ان کو جواب دینا تھا اور بتانا تھا کہ میں جو تعلیم لایا ہوں یہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے شیطان کی طرف سے نہیں۔ آپ نے ان کے جواب میں اس مثال کو دہرانا تھا چنانچہ آپ نے فرمایا کہ "اگر خدا تمہارا باپ ہوتا تو تم مجھ سے محبت رکھتے۔ اس لئے کہ مَیں خدا سے نکلا اور آیا ہوں کیونکہ میں آپ سے نہیں آیا بلکہ اسی نے مجھے بھیجا۔ تم میری باتیں کیوں نہیں سمجھتے؟ اس لئے کہ میرا کلام سن نہیں سکتے تم اپنے باپ ابلیس سے ہو اور اپنے باپ کی خواہشوں کو پورا کرنا چاہتے ہو۔ 3 اب اگر اس سارے واقعہ کو علیحدہ کر کے صرف اسی کو لے لیا جائے کہ تم اپنے باپ ابلیس سے ہو تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے گالی دی ہے لیکن حقیقت یہ نہیں۔ تو بعض دفعہ کوئی لفظ اگر الگ کر کے دیکھا جائے تو وہ سخت معلوم ہوتا ہے مگر اپنی جگہ پر وہ سخت نہیں ہوتا۔

پس دوستوں کو چاہیئے کہ ہمیشہ نرم الفاظ استعمال کیا کریں۔ بے شک ان کی سخت کلامی کو دیکھ کر طبیعت میں غصہ آجاتا ہے مگر اس غصہ کے نکالنے کی میں ایک اور ترکیب بتا دیتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ بجائے ان کو گالیاں دینے کے ان کی دی ہوئی گالیوں کو جمع کر دیا جائے اور پھر ان کو شائع کر دیا جائے۔ یہ بہت مؤثر طریق ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ سخت کلامی کرتے ہیں اور پھر یہ بھی کہتے رہتے ہیں کہ مبائعین سختی کرتے ہیں اس لئے جس دوست کے دل میں ان کی سخت کلامی کی وجہ سے غصہ پیدا ہو وہ بجائے جواب میں سختی کرنے کے ان کی گالیوں کو جمع کر دے۔ ان کے مضامین اور کتابوں میں کافی گالیاں ہمیں دی گئی ہیں۔

ایک دفعہ میں ڈلہوزی میں تھا کہ مولوی غلام حسن خان صاحب پشاوری، دلاور خان صاحب جو صوبہ سرحد میں اسسٹنٹ کمشنر ہیں اور سید عبدالجبار شاہ صاحب جو پہلے سوات کے بادشاہ تھے مگر اب معزول ہیں تینوں یا ان میں سے کوئی دو وہاں میرے پاس پہنچے۔ یہ تینوں اُس زمانہ میں پیغامی تھے اور اب ان میں سے دو تو بیعت کر چکے ہیں اور تیسرے یعنی عبدالجبار شاہ صاحب کسی کی طرف بھی نہیں۔ گو پیغامی ان کو اپنی طرف ظاہر کرتے ہیں بہرحال وہ ہماری جماعت میں شامل نہیں ہیں۔ یہ لوگ میرے پاس آئے اور بیان کیا کہ ہم چاہتے ہیں کہ صلح ہو جائے۔ میں نے کہا صلح سے بہتر کیا چیز ہے مجھے منظور ہے۔ آپ صلح کی تجاویز پیش کریں۔

انہوں نے غور و فکر کے بعد کہا کہ فی الحال اور صلح تو ممکن نہیں یہ ممکن ہے کہ ایک دوسرے کو برا بھلا نہ کہا جائے۔ میں نے کہا بہت اچھا۔ یہ لوگ مولوی محمد علی صاحب کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے مولوی صاحب بھی ڈلہوزی میں ہی تھے۔ آخر فیصلہ ہؤا کہ ایک دوسرے کو بُرا بھلا نہ کہنے کے متعلق سمجھوتہ ہو جائے۔ چنانچہ سمجھوتہ ہوا اور لکھا گیا۔ اسکے بعد میں نے مولوی محمد علی صاحب کی دعوت کی اور مولوی صاحب نے میری کی اور فیصلہ ہو گیا کہ اخباروں کو روک دیا جائے کہ ایک دوسرے کو بُرا بھلا نہ کہیں۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد پیغام صلح میں ڈاکٹر بشارت احمد صاحب کا ایک مضمون نکلا جو بہت سخت تھا۔ اس پر مَیں نے ان صلح کرانے والوں کو توجہ دلائی اور مجھے سید عبد الجبار صاحب کا خط آیا کہ میں نے مولوی غلام حسن خان صاحب سے بات چیت کی ہے اور ہم دونوں کی یہی رائے ہے کہ پیغام صلح نے زیادتی کی ہے اور معاہدہ کو توڑا ہے۔ دلاور خان صاحب تو جلدی ہی بعد میں بیعت میں شامل ہو گئے اور مولوی غلام حسن خان صاحب نے اب بیعت کر لی ہے۔ سید عبد الجبار شاہ صاحب نے دو کشتیوں میں پیر رکھے ہیں۔ یہ میری رائے ظاہری لحاظ سے ہے دل کا حال اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

اسی ضمن میں مجھے ایک لطیفہ بھی یاد آ گیا۔ دلاور خان صاحب سر عبد القیوم صاحب کے جو صوبہ سرحد میں پہلے وزیر اعظم تھے اب فوت ہو چکے ہیں داماد ہیں۔ دراصل وہ ان کی بہن کے داماد ہیں مگر چونکہ بہن کی اولاد کو سر موصوف نے ہی اپنے طور پر پالا تھا اس لئے سر موصوف دلاور خان صاحب کو اپنی اولاد ہی کی طرح چاہتے تھے۔ وہ وائسرائے کی کونسل کے ممبر تھے اور اس سلسلہ میں شملہ آئے ہوئے تھے کہ میری ان سے ملاقات ہوئی۔ ان کے ایک چچازاد بھائی بھی احمدی ہیں۔ بھائی سے تو ان کو کچھ رقابت تھی مگر خان صاحب سے محبت تھی۔ میں اسمبلی دیکھنے گیا تو وہ وہاں مجھے ملے اور کہنے لگے کہ میرا بھائی آپ کا غالی مرید ہے۔ بات کرتے وقت اتنا جوش میں آ جاتا ہے کہ اسے سمجھ نہیں رہتی دلیل کیا ہوتی ہے۔ دلاور خان سے اس کی بحث ہوئی۔ دلاور خان تو ٹھنڈی باتیں کرتے رہے مگر اسے طیش آ گیا۔ دراصل اپنے بھائی کے متعلق ان کا جو خیال پہلے سے تھا اس رائے میں بھی وہ غالب تھا۔ اُس وقت اسمبلی کے بعض اور ممبر بھی کھڑے تھے اور وہ اس رنگ میں بات کر رہے تھے کہ گویا آپ کے مرید کو

شکست ہوئی مگر مجھے خدا تعالیٰ نے شرمندگی سے بچانا تھا میرے پاس ایک ہی دن پہلے دلاور خان صاحب کا بیعت کا خط آچکا تھا۔ میں نے کہا سر عبدالقیوم صاحب! بے شک آپ کے خیال میں ہمارے آدمی کو شکست ہوئی مگر دیکھنا تو نتائج کو چاہیئے۔ دلاور خان صاحب کا بیعت کا خط کل مجھے مل چکا ہے۔ یہ بات سن کر وہ کہنے لگے کہ اچھا! اب اسمبلی کا اجلاس شروع ہونے والا ہے مَیں پھر آپ سے بات کروں گا۔ تو فتح کے سامان ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتے ہیں۔ ڈلہوزی میں جو صلح ہوئی تھی میں نے اس کی پابندی کی اور نرمی سے کام لیا مگر پیغامیوں نے اس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے پھر سخت کلامی شروع کر دی۔ نتیجہ یہ ہؤا کہ صلح کرانے والوں میں سے دو آدمی اِس وقت تک بیعت میں شامل ہو چکے ہیں۔ سید عبدالجبار صاحب پر بھی حجت تو پوری ہو چکی ہے مگر ابھی تک انہوں نے بیعت نہیں کی۔ ان کو اپنی بہن پر بڑا اعتقاد ہے اور ان کی بہن کو اپنی خوابوں پر بڑا اعتقاد ہے اور ان کا خیال ہے کہ ان کے پاس جن آتے ہیں اور باتیں وغیرہ کرتے ہیں اور وہ کہتی ہیں کہ جو جن آتے ہیں وہ میری ہی بیعت کرتے ہیں اور سید صاحب ہنس کر کہا کرتے ہیں کہ جن تو آپ کی بیعت ہی کرتے ہیں۔ وہ جن ہیں یا فرشتے؟ جو بھی ہیں بہرحال ان کا میری بیعت کرنا ان کے لئے حجت ہے مگر انہوں نے ابھی تک بیعت نہیں کی۔

پس ہمیشہ نرمی سے کام لو اور محبت دکھاؤ۔ حضرت مسیح ناصری علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ یہ دیو دعاؤں اور روزوں سے نکلا کرتے ہیں۔ دیو سے مراد تعصب ہے اور روزہ بھی دراصل دعا کا ہی حصہ ہے کیونکہ روزہ سے دعا میں طاقت پیدا ہوتی ہے اور روزہ دعا کو زبردست کر دیتا ہے۔ قرآن کریم نے بھی بتایا ہے کہ روزہ کے ایام میں جو دعائیں کی جائیں وہ قبول ہوتی ہیں۔

پس مَیں دوستوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ اس کام کو اختیار کرتے وقت تقویٰ اور خشیتِ الٰہی سے کام لیں۔ فتح وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے اور جس میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہو۔ جس فتح میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی نہ ہو اُس سے شکست بہتر ہے جو اس کی رضا کے ماتحت ہو۔

حضرت خلیفہ اول مولوی عبد اللہ صاحب غزنوی کا جو امرتسر کے غزنوی خاندان کے مورث تھے ایک واقعہ سنایا کرتے تھے۔ وہ اہلحدیث تھے۔ حنفیوں کے بھی ایک بڑے مولوی امرتسر میں تھے۔لوگ ان کو مولوی عبد اللہ صاحب کے پاس بحث کرنے کے لئے لے گئے اور جا کر کہا کہ یہ آپ سے سوال کریں گے آپ جواب دیں۔ مولوی عبد اللہ صاحب نے کہا کہ اگر نیت بخیر باشد۔ حنفی مولوی بھی نیک آدمی تھے مولویانہ رنگ میں لوگوں کے ساتھ چلے گئے تھے۔ یہ فقرہ سن کر ان پر اتنا اثر ہوُا کہ کہنے لگے میں ان سے بحث نہیں کرتا۔ بحث نیتِ خیر کہاں رہنے دیتی ہے۔ تو ان کے اس نیک نیتی کے فقرہ کا ایسا اثر ہوُا کہ دوسرے نے بحث سے ہی انکار کر دیا۔

پس آپ لوگ بھی تقویٰ سے کام لیں اور کوشش کریں کہ جو فتح حاصل ہو وہ ہماری نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ اسے اپنی فتح قرار دے۔ ایسی فتح جسے خدا تعالیٰ پھینک دے اور کہے کہ یہ میری فتح نہیں بلکہ شیطان کی ہے کسی کام کی نہیں۔ پس ایسے ذرائع استعمال کرو کہ ان کے نتیجہ میں جو فتح ہو وہ خدا تعالیٰ کی ہو اور اس کی خوشنودی کا موجب ہو۔ اگر کبھی سختی بھی کرنی پڑے اور کوئی ایسا مسئلہ درپیش ہو کہ اس میں حقیقت کا اظہار مخالف کو ناگوار ہونا لازمی ہو تو بھی الفاظ ایسے استعمال کرو جو کم سے کم برے لگیں۔ بعض مسائل ایسے ہیں کہ میں نے دیکھا ہے میں نے بھی جب کبھی ان کو بیان کیا پیغامیوں نے شور مچایا ہے کہ ہمیں گالیاں دی گئی ہیں۔ ایک بات وہی ہے جو میں نے گزشتہ خطبہ میں بیان کی تھی کہ مولوی محمد علی صاحب صدر انجمن سے تنخواہ لے کر قرآن کریم کا ترجمہ کرتے رہے، انجمن کے خرچ پر پہاڑ پر جاتے رہے مگر یہاں سے جاتے ہوئے اس ترجمہ کو ساتھ لے گئے اور اب اس کی فروخت پر حقِ ملکیت بھی لے رہے ہیں۔ بلکہ میں نے سنا ہے کہ اپنے بعد اس حق کی وصیت اپنی بیوی بچوں کے نام کر دی ہے۔ یہ ایسی بات ہے کہ اسے کتنے ہی نرم الفاظ میں بیان کیا جائے بہر حال ان کو بُری لگے گی۔ مگر ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ زیادہ سے زیادہ نرم الفاظ میں اسے بیان کریں۔

ابھی ایک غیر مبائع دوست کی طرف سے مجھے شکایت آئی ہے کہ مولوی ابوالعطاء صاحب نے ہم پر بہت سختی کی ہے۔ ابھی مجھے یہ تو پتہ نہیں لگا کہ کیا سختی کی ہے۔ انہوں نے

تین چار باتیں لکھی ہیں جو مولوی صاحب نے ان سے کیں اور میں نے دریافت کرایا ہے کہ ان میں سے کون سی بات کرنے میں مولوی صاحب نے سختی سے کام لیا۔ مگر جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے بعض باتیں ہی ایسی ہیں کہ ان کو بیان کیا جائے تو سختی معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً یہی کہ یہ لوگ کہتے ہیں غیر احمدیوں کو لڑکیاں دینی جائز ہیں۔ اس پر اگر سوال کیا جائے کہ آپ میں سے کس کس نے لڑکیاں غیر احمدیوں کو دی ہیں۔ تو یہ ان کو بری لگتی ہے مگر ہم یہ اس لئے کہتے ہیں کہ ان کا نہ دینا اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ عقیدۃً ہم سے متفق ہیں۔ صرف مصلحتاً یہ بات کہتے ہیں ورنہ کیا وجہ ہے کہ اگر وہ دل میں بھی اس کو جائز سمجھتے ہیں تو اس پر عمل نہیں کرتے جبکہ بات یہ ہے کہ جیسے لڑکے احمدیوں میں ان کو مل سکتے ہیں ویسے ہی بلکہ ان سے اچھے دنیوی لحاظ سے غیر احمدیوں میں بھی مل سکتے ہیں۔ اگر تو کسی امیر سے کہا جائے کہ اپنی لڑکی کا رشتہ کسی فقیر کو دے دو تو وہ کہہ سکتا ہے کہ میری لڑکی کو جیسی عادتیں ہیں ان کے ہوتے ہوئے کسی فقیر کے ہاں اس کا گزارہ نہیں ہو سکتا۔ یا کسی تعلیم یافتہ لڑکی کا گزارہ جاہل خاندان میں مشکل ہے۔ مگر یہ باتیں ایسی ہیں کہ ان کے لحاظ سے احمدیوں اور غیر احمدیوں میں فرق نہیں۔ اگر ایک احمدی سید ہے تو غیر احمدی بھی ہے۔ اگر ایک احمدی سید امیر ہے تو غیر احمدی سید بھی امیر ہے۔ اگر ایک احمدی سید، امیر، تعلیم یافتہ ہے تو غیر احمدی بھی سید، امیر اور تعلیم یافتہ مل سکتا ہے۔ اگر کوئی احمدی سید، امیر، تعلیم یافتہ، اچھے اخلاق اور عمدہ آداب والا ہے تو غیر احمدی بھی ایسا ہی مل سکتا ہے۔ وہاں کفو کا کوئی سوال نہیں جس پر اعتراض ہو سکے۔ اب سوال یہ ہے کہ جب اچھے سے اچھا سید غیر احمدیوں میں بھی مل سکتا ہے تو جو لوگ ان کو لڑکی دینا جائز سمجھتے ہیں وہ دیتے کیوں نہیں؟ یہ اِس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے دل یہی مانتے ہیں کہ جائز نہیں۔ صرف غیر احمدیوں کو خوش کرنے اور ان سے چندے لینے کے لئے یہ کہتے ہیں۔ یہ بات ایسی ہے کہ اگر کہی جائے تو وہ ضرور چِڑ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں گالیاں دیتے ہیں۔ حالانکہ جب یہ بات ان کے نزدیک جائز ہے تو گالی کیسے ہو گئی؟ اس غیر مبائع نے لکھا ہے کہ مولوی ابوالعطاء صاحب نے گالیاں دیں اور کہا کہ تم غیر مبائعین یہ عقیدہ رکھتے ہو کہ غیر مبائعین کو لڑکیاں دینی جائز ہیں۔ ممکن ہے انہیں تم کا لفظ بُرا لگا ہو۔ یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ وہ یہ عقیدہ نہ رکھتے ہوں

اس لئے یہ بات بُری لگی ہو اور پھر یہ بھی ممکن ہے کہ مولوی صاحب نے کہا ہو تم دیتے کیوں نہیں؟ اور یہ بات بُری لگی ہو۔ بہر حال میں نے دریافت کرایا ہے کہ مولوی صاحب نے کون سی گالی دی۔ بہر حال بعض باتیں ایسی ہیں کہ جو بیان کی جائیں تو ان کو بُری لگتی ہیں اور ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب وہ اس قسم کے ازدواج کو جائز سمجھتے ہیں تو پھر لڑکیاں دیتے کیوں نہیں جبکہ غیر احمدیوں میں بھی قوم، تعلیم اور اخلاق کے لحاظ سے ایسے لڑکے مل سکتے ہیں جیسے احمدیوں میں۔ اور ان کا ایسا نہ کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ یا تو وہ دل میں اسے جائز نہیں سمجھتے اور یا ان کے دماغ تو اس کو جائز سمجھتے ہیں مگر دل ڈرتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا موجب ہو گا اور یہ ایسی بات ہے کہ جب بھی کی جائے ان کو بُری لگے گی۔ مگر مسئلہ کو سمجھانے کے لئے ہم بھی کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ تاہم میں یہ نصیحت کرتا ہوں کہ اگر کوئی ایسی بات کرنی بھی پڑے تو نرم الفاظ میں کی جائے۔

پس میں جہاں یہ ہدایت کرتا ہوں کہ غیر مبائعین کا مقابلہ پورے زور سے کیا جائے وہاں یہ بھی نصیحت کرتا ہوں کہ ایسا طریق اختیار کیا جائے جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا موجب ہو اور اسے ناراض کرنے والا نہ ہو۔ اور یہ بات کہہ کر میں خدا تعالیٰ کے حضور سبکدوش ہوتا ہوں۔ یہی طریق ہے جس میں دین کی فتح ہو سکتی ہے اور جس میں خدا تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہو سکتی ہے۔ ورنہ جس فتح میں خدا تعالیٰ کی خوشنودی نہ ہو اس کی طرف تو مومن کو نگاہ اٹھا کر بھی کبھی نہ دیکھنا چاہیئے۔" (الفضل یکم مئی 1940ء)

1، 2 تذکرہ صفحہ 10 ایڈیشن چہارم

3 یوحنا باب 8 آیت 42 تا 44